''مقابلہ؟''

''مقابلہ۔''

ارشد نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''کس میں؟''

''تم بتاؤ۔''

''تم بتاؤ۔''

''ہم نہیں بتاتے۔''

''ہم بھی نہیں بتاتے۔ کوئی زبردستی ہے۔'' تھوڑی دیر کے لئے کارروائی رک گئی۔

''اپ اینڈ ڈاؤن میں کرلو......'' تماشائی ہجوم میں سے کسی نے تجویز کیا۔

''ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' ایک غلغلہ بلند ہوا اور کھلبلی مچ گئی۔ دونوں ٹیمیں آمنے سامنے اکٹھی ہونے لگیں۔ آ جاؤ۔ ادھر آؤ۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ ارے میاں پینک میں ہو؟ دیکھو۔ نہیں نہیں۔ ہاں چلو۔ دیا سلائی۔ دیا سلائی کہاں ہے؟ ارے دیا سلائی کوئی آدمی جا کے لاؤ بھائی

''ہاں [illegible]'' [illegible] اور دوڑا۔

''دیا سلائی۔''

''ابھی لایا جی......'' مالی سوتی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ مارتا ہوا روشوں پر بھاگنے لگا۔

''دو...... دو......'' ارشد نے دو انگلیاں ہوا میں ہلائیں۔ ''سیدھی قطار میں کھڑے ہو میاں...... سپورٹس مین شپ کہاں گئی تمہاری۔ ایک ایک فٹ پر۔ ایک ایک فٹ۔'' قیامت کے شور پر قابو پانے کے لئے ارشد چلاتا ہوا تیزی کے ساتھ قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

سامنے گھاس پر بیٹھے ہوئے وحید کے اوپر کھڑا اخیات اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ ''اٹھو......''

''میں نہیں کھیلتا۔'' وحید نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کندھا چھڑا کر کہا۔

''ارے واہ۔ کوئی بات ہے! سپورٹس مین شپ سپرٹ کا یہ حال ہے؟ ڈوب مریے۔'' بازو سے پکڑے پکڑے وہ اسے قطار کے سرے پر لے گیا۔

ارشد کرسی پر کھڑا جوش سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے لڑکیوں کی قطار تھی جس کے آگے شیریں اور نرگس ہڑبڑائی پھر رہی تھیں اور اپنی کھلاڑیوں کو کھیل کے قوانین ذہن نشین کرا رہی تھیں۔

''خاموش...... خاموش...... بھائیو۔'' ارشد نے دونوں بازو ہوا میں ہلا کر کہا۔ ''دوستو اور بھائیو۔ یہ کھیل کا مقام نہیں، ہماری ناک کا سوال ہے۔''

''بلکہ مقام ہے۔'' ایک لڑکی نے چپکے سے کہا۔

''بالکل درست ہے۔'' پرویز سنجیدگی سے بولا۔ لڑکوں نے تالیاں پیٹیں۔ چند ایک نے ناکوں کو چھو کر دیکھا۔

''خاموش۔ یہ تالیاں پیٹنے کا مقام بھی نہیں' بلکہ رونے کا مقام ہے کہ آج لڑکیاں ہمارے مقابلے پر میدان میں نکل آئی ہیں۔''

''بہتر ......'' مسرت کے ایک ریلے میں غیاث نے تالی بجائی لیکن فوراً ہی موقع کی نزاکت کا خیال کر کے رک گیا۔ اکلوتی تالی فضا میں ہلکا سا پٹاخہ چھوڑ کر ختم ہو گئی۔ ارشد نے اسے سختی سے گھورا۔ قطار کے سب لڑکوں نے گھورا۔ غیاث انتہائی مسکین شکل بنا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واقعے کی شدید مضحکہ خیز نوعیت کو محسوس کر کے لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ارشد نے تقریر جاری رکھی۔

''دوستو۔ آؤ ہم عہد کریں کہ آج ہم نظم و ضبط کا بہت بڑے پیمانے پر مظاہرہ کریں گے۔ آؤ ہم ...... آؤ۔'' الفاظ اس کے ذہن سے غائب ہو گئے۔ دوبارہ اس نے کہا ''آؤ ......'' کہا جس کے جواب میں قطار میں سے کوئی مستعدی سے بولا ''آ گئے!'' الفاظ کی تلاش میں اس نے مٹھی ہوا میں بلند کی اور چند ثانیے تک ہلاتا رہا۔ پھر یک بیک وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان پر انگلی ہلائی۔ ''اور تم۔ سنو۔ تم اپنی تقریر کرو۔ سنا؟'' اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

لڑکیاں [illegible] بچوں کے گروہ سے ایک کرسی حاصل کرائی گئی جس کی ایک ٹانگ پارٹی کے ابتدائی دور میں ہی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی ٹانگ جوڑنے اور کامیاب پلیٹ فارم بنانے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔

ارشد کی خطابت اب اپنے عروج پر تھی۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا: ''آج ہم ایک خوفناک چیلنج سے دوچار ہیں۔ آج'' کہ ایک لڑکی کی مداخلت سے اس کی تقریر رک گئی۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر اعلان کیا۔

''لڑکیاں کم ہیں۔''

''نہیں پوری ہیں۔''

''نہیں کم ہیں۔''

''پوری ہیں۔ دھاندلی مت کرو۔''

اب تمام لڑکے بادلِ ناخواستہ متوجہ ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی جلد پر گننا شروع کیا۔ ''الماس' شیریں' طلعت۔ عذرا کہاں ہے؟''

''کہاں ہے۔''

''ہاں ہاں' کہاں ہے؟''

''کون؟''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

''لاحول ولا قوۃ''

''عذرا کہاں ہے؟ عذرا۔'' کورس بلند ہوا۔ پھر ہال کے عقب میں عذرا عذرا کی پکار کونے کونے میں پھیل گئی۔

''میں ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ تم کارروائی جاری رکھو۔'' وحید نے جاتے جاتے ارشد کی پیٹھ ٹھونکی۔

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شیریں پہلے تقریر شروع کر چکی تھی۔ جب ارشد نے بولنا شروع کیا تو ان کی آوازوں نے مل کر عجب شور پیدا کر دیا جس میں صاف طور سے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ مگر اس بات سے بے پرواہ دونوں مخالف ٹیمیں نہایت اعتماد اور وفاداری کے ساتھ سنتی رہیں۔

وہ وہاں سے کیوں چلی آئی تھی؟ کیوں؟ اس نے جھک کر فوارہ اٹھایا' پھر فوراً نیچے رکھ دیا اور کھڑی رہی۔ ابھی ابھی وہ گھاس پر اس کے قریب بیٹھی تھی اور وہ جھک کر اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ''آہستہ برگ گل بہ فشاں......'' اور اس کی بھاری' نرم آواز اس نے گردن کی جلد پر پھیلتی ہوئی محسوس کی تھی اور اس کے سانس کی نیم گرم بھاپ اس کے گال سے ٹکرائی تھی (اس نے بے خبری میں ہاتھ اٹھا کر گال کو چھوا) اور وہ وقت بے حد خاموش ہو گئی تھی۔ وہ خوف [illegible] آنکھوں میں ایسی فی الواقعہ بڑی عجیب بات تھی' لیکن بہرحال تھی۔ کہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اس کی نظریں اپنے گال میں اترتی ہوئی محسوس کی تھیں اور اس نے اُدھر دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر میں جب ان تیز' کاٹتی ہوئی نظروں کے نیچے اس کے گال کی جلد کپکپانے اور اس جگہ پر خون اُبلنے لگا تھا تو اچانک بہت زیادہ گھبرا کر اس نے اُدھر دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گائے کے بچے کی سی نرمی اور نزاکت تھی۔ خدایا' وہ دوبارہ اسے اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ اپنے تکلیف زدہ دل کے ایک میکانکی اشارے پر کچھ سوچے سمجھے اور محسوس کیے بغیر!

مگر کیا یہ سب ٹھیک تھا؟ وہ جانتی تھی۔ اس نے محبت کا تجربہ کیا تھا اور اس کے دل میں رنج تھا۔ وہ سب جانتی تھی اور اسی لئے اس وقت کی اس ایک لمحے کی دہشت اس پر سوار تھی۔ اس نے دوبارہ فوارہ اٹھا لیا۔ گلاس کے ننھے پودے کو پانی دیتے ہوئے اپنے نام کی پکار اس کے کان میں پڑی اور اس وقت اپنے تمام گزشتہ رنج کو یکجا کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ اب کسی شک' کسی لغزش کی گنجائش نہیں تھی۔

روش پر اسے جانے پہچانے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ''وحید' صاحبزادہ وحید الدین آف...... کمبخت!'' چھوٹے چھوٹے' تیز' مستعد قدموں کے نیچے سرخ بجری چرچرا رہی تھی۔ ان قدموں سے وہ اتنی واقف اور مانوس تھی جتنی وہ روشن آغا اور پرویز اور تقریباً سب دوستوں کے قدموں سے تھی۔ ''آہستہ برگ گل......'' جانے کس کا شعر تھا

لیکن وہ اس سے واقف تھی۔ 'میں یہاں سے چلی جاؤں؟ میں بخدا ہرگز یہ نہیں۔ آہستہ برگ گل۔ فوارہ خالی ہو رہا تھا لیکن اس نے پانی دینا جاری رکھا۔ پانی پودے کی جڑوں میں سے بہہ بہہ کر روش پر پھیل رہا تھا۔ ننھے پودے کی پتیوں پر پانی ڈالنے کا عمل اسے بہت بھلا لگا۔ سارے پانی کو وہیں پر ختم کر دینے کی دیوانی خواہش بڑی شدت سے اس کے دل میں پیدا ہوئی اور ایسا کرتے ہوئے ایک عجیب' بے وجہ خوشی کی لہر اس کے وجود پر پھیل گئی اور اس کے کان سنسنانے لگے۔

گردن پر اسی جگہ اس نے اس کے سانس کی بھاپ کو محسوس کیا۔ ''عذرا بیگم آپ کیوں چلی آئیں؟''

''میرا گلاب سوکھ رہا تھا۔ صاحبزادہ صاحب۔'' اس نے اسی اخلاق سے جواب دیا۔

دونوں ہنس پڑے۔ عذرا نے فوارہ نیچے رکھ دیا۔

وحید نے جوتے کی نوک سے پانی کو چھوا۔ ''ابھی ابھی میں اس سبزے کو دیکھ رہا تھا جس پر تم بیٹھی تھیں۔''

''اچھا.....'' عذرا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''میں نے اسے چھوا تو وہ ابھی تک گرم تھا اور اس میں سے تمہاری خوشبو آ رہی تھی۔''

''اوہ۔'' وہ ہنسی۔

''تم نے کبھی سبزے کو دیکھا ہے۔'' ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وحید نے پوچھا۔ ''جس پر سے کوئی اٹھ کر گیا ہو؟''

''ایں؟ نہیں۔''

''اس کی ایک ایک پتی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے اور جانے والے کے جسم کی حرارت اور خوشبو چھوڑتی ہے۔ سبزے کی عجیب خاصیت ہوتی ہے۔ دن بھر اس کو آنے جانے والے روندتے رہتے ہیں لیکن اس کا ایک ایک تنکا' ایک ایک پتی سر اٹھاتی ہے اور بڑھتی ہے۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔''

باڑ کے پیچھے بیک وقت ارشد اور شیریں کی تقریروں سے فضا گونج رہی تھی اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ دونوں سرخ راستے پر آتے اور جاتے رہے۔

''کس قدر ہنگامہ کر رہے ہیں یہ لوگ۔'' عذرا نے خوش دلی سے کہا۔

''ہنگامہ ہنگامہ۔'' وہ اکتاہٹ سے بولا۔ ''لڑکیوں میں وہ ایک چیز اررر..... وہ جسے انگریزی میں 'گریس' کہتے ہیں' ہونی چاہیے۔''

''ایں؟ لپ اینڈ نوز؟'' عذرا نے باڑ کے پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو عذرا تم نے بے چارے پودے کو اتنا پانی دے دیا کہ پتیوں پر ابھی تک بوندیں رکی ہوئی ہیں۔ یوں جیسے ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی آنکھیں لگی ہوں۔''

عذرا اس کی طرف دیکھ کر تمسخر سے مسکرائی اور یک بیک پلٹ کر چلنے لگی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوا اس سے آملا۔

''میں کبھی اندازہ نہیں کر سکا کہ ابھی اگلے لمحے تم کیا کرنے والی ہو۔'' اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔

UrduPhoto.com

''کدھر کو جانے والی ہو' کیا کہنے والی ہو۔ یہ تمہاری شخصیت ہے۔ پتہ نہیں کیوں عذرا' پر یہ سچ ہے کہ..... میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑی عجیب و غریب لڑکی ہو۔''

''پتہ نہیں کیوں وحید۔'' عذرا نے اسی لہجے میں کہا۔ ''پر یہ سچ ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت باتیں کرتے ہو۔''

''ٹھہرو عذرا۔ میری بات سنو۔''

وہ اس کے لہجے کو محسوس کر کے ٹھٹک کر رک گئی۔

''ہم ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ اتنے عرصے سے ایک دوسرے سے واقف ہیں' ان راستوں سے..... واقف ہیں۔''

گھبراہٹ میں عذرا نے راستے سے اتر کر سبزے پر قدم رکھا۔

''میں اررر..... اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا ہوں جب۔ تم سے ملتا ہوں۔ اس کا مطلب سمجھتی ہو کیا ہے۔ تم.....''

وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وحید وہیں کھڑا جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی ان میں جا ملا۔

کھیل کا مقابلہ شروع تھا۔ چند لمحے تک وہ گم سم کھڑی رہی۔ رنج اور تمسخر کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک انجانی خوشی بھر گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ پورے زور کے ساتھ چیخے اور وہ گلا پھاڑ کر چلائی۔ ''شاباش..... شاباش۔''

(یہ اونچی متوسط طبقے کے ہندوستان کی وہ خوش تربیت' صحت مند نسل تھی جو انگریزی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی تھی یا پا چکی تھی اور جن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ لیکن جن برسوں کی ہم بات کر رہے ہیں اس وقت یہ لوگ تعداد میں ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں کسانوں' مزدوروں اور محنت کش طبقے کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھے اور شہروں سے باہر اپنے کھلے' ہوادار مکانوں میں رہتے تھے۔)

سونے سے پہلے عذرا نے مشرقی دریچے کے پٹ کھولے اور دور دور تک پھیلی ہوئی رات کو دیکھا۔ یوکلپٹس کے پتے ہوا میں ہل رہے تھے۔ وہ دریچے کے چھجے پر بیٹھی ان کی ہلکی خوشبو (جس کے ساتھ قطعی طور پر زکام کا خیال شامل تھا) کو سونگھتی رہی۔ برآمدے میں کسی نوکر کے گزرنے کی چاپ سنائی دی۔ دس بج گئے' اس نے سوچا۔ وہ سہم کر اٹھی اور دریچہ بند کر کے پردہ ہموار کر دیا۔ گزرے ہوئے دن کی مسرت ابھی تک اس کے اعضا پر موجود تھی۔ اس نے تپائی کا سبز لیمپ جلایا اور بڑی بتی گل کر کے بستر میں گھس گئی۔ لیٹے لیٹے اس نے دیکھا کہ کارنس پر پڑی ہوئی تمام چیزوں پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے رات کے لباس سے رگڑ کر انہیں صاف کرنے لگی۔ کانسی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے اور ہاتھی۔ سفید پتھر کا تاج محل۔ چینی کے گلدان۔ خشک پھولوں کو نکال کر اس نے آتشدان میں پھینکا۔ سنہری فریم میں سے جھانکتی ہوئی روشن آغا کی تصویر۔ پھر اس کی نظر اپنے سازوں

UrduPhoto.com

پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے دو انگلیاں سازوں پر رکھیں' پھر اردگرد چھائے ہوئے گمنام' نازک سکوت کو توڑ دینے کے ڈر سے فوراً اٹھا لیں۔ وہ اس مقدس خاموشی کو توڑنا نہیں چاہ رہی تھی۔ کسی بھی شے' کسی بھی احساس کو جو اس وقت ظاہر تھا اور جم چکا تھا' وہ بکھیرنا نہیں چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ دن جو گزر چکا تھا' اپنی طرف سے اسے ختم کرتے ہوئے وہ ڈر رہی تھی اور اسے جاری رکھنے کے لئے مصروفیتیں تلاش کر رہی تھی' تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ کل کا دن شاید کچھ بھی ساتھ نہ لائے۔ اس نے سوچا۔ آج کا یادگار دن' یہ لمحہ' یہ لحظہ' یہ پل' کس قدر تیز رفتار ہے۔ تیز اور مسرور۔ آہستگی سے اس نے سازوں کو جھاڑا اور واپس آ گئی۔ الماری میں اس کی کتابیں بھی گرد آلود تھیں..... پھر ایک اچانک خیال سے کہ اندھیرا پھیلنے سے وقت کی اڑان تھم جائے گی ہاتھ کی ایک جلد باز جنبش سے اس نے میز کا لیمپ گل کر دیا۔ مگر اسی لمحے اور اس سے اگلے لمحے' اور اس سے اگلے' اس نے رات کے گزرنے کی سرسراہٹ کو صاف طور پر سنا اور اپنے احساس کی شدت پر دل میں تعجب کیا۔ اسی جلد بازی کے ساتھ اس نے لیمپ جلایا اور مدھم سنہری روشنی میں کارنس پر پھیلی ہوئی پیروں کو خوشی سے دیکھا۔ بیک وقت بے چینی اور سکون جو اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا اس کے زیر اثر اس نے لیمپ بجھایا اور جلایا' بجھایا اور جلایا۔

ان گنت بار ایسا کرنے کے بعد آخر کار دن بھر کی تھکاوٹ نے اسے خود بخود سلا دیا۔ بڑھتی ہوئی رات میں لیمپ صبح تک جلتا رہا۔

UrduPhoto.com

(۱۶)

شروع ماگھ میں ایک روز بہت سویرے نعیم شیشم کے اس پیڑ کے نیچے پہنچا جہاں سے روشن پور کے کھیت شروع ہوتے تھے اور آنے والوں کو پہلی مرتبہ گاؤں کے درخت اور دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ ملگجی روشنی میں اس نے دھوئیں اور دھند میں لپٹے ہوئے اس پرانے' محبوب گاؤں کو دیکھا اور اس کا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔ مشرق کی طرف ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ گیہوں اور چنے کی فصلوں پر ماگھ کی دھند دور دور تک تیر رہی تھی اور کھیتوں کی لکیریں کہرے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ساری آباد اور غیر آباد زمینوں پر تیز سرد شمالی ہوا چل رہی تھی۔ وہ میلا لمبا کوٹ' گرم فوجی ٹوپی اور بڑے فوجی بوٹ پہنے شیشم کے قدیم' سیاہ تنے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ پھر بھی ہوا اس کا کوٹ اڑا کر ٹانگوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کڑاکے کی سردی میں بھی دس کوس پیدل چلنے کے بعد اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر پتلے شیشے کا سا کہرے کا ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں رکھ کر چوسنے لگا۔ پھر وہ اس وقت تک کھڑا محبت' افسردگی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گاؤں کو دیکھتا رہا جب تک کہ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے اسے چلنے پر مجبور نہ کر دیا۔

بوٹوں پر لگے ہوئے کہرے اور کیچڑ کو تنے سے رگڑ کر صاف کرنے کے بعد وہ دوڑتا ہوا اسے چھوٹے

سے ٹیلے پر سے اترا اور جانے پہچانے کھیتوں میں داخل ہوا۔ خاموش، منجمد صبح میں بھاری بوٹوں کے نیچے کہرے کے ٹوٹنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ اس نے گیہوں کی چند نرم پتیاں توڑ کر منہ میں رکھیں اور چبانے لگا۔ "ابھی یہ کچھ نہیں کہتیں۔ پھاگن میں زبان کو کاٹنے لگیں گی۔" سبز تھوک نگلتے ہوئے اس نے سوچا۔ "احمد دین نے اس دفعہ پچھیتر میں بیائی کی ہے۔"

اگلے کھیت میں، اور اس سے اگلے میں اسے چند کسان ملے جو منہ اندھیرے ہل کندھوں پر اٹھائے بیلوں کے پیچھے پیچھے نکل آئے تھے۔ نعیم کوٹ کا کالر کھڑا کئے، ٹوپی میں منہ چھپائے خاموشی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے سب کو پہچانا۔ گرو، دینا ناتھ۔ کرم سنگھ۔ امام دین پہلوان۔ یہ وہی پرانے لوگ تھے جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سب حقوں سے منہ ہٹا کر غیر مانوس لباس والے اس راہگیر کو دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ صرف امام دین نے اسے دیکھ کر کمبل لپیٹتے ہوئے کہا: "سن چودہ میں ایسا جاڑا آیا تھا۔" پھر نعیم کو خاموشی سے گزر کر جاتے ہوئے دیکھ کر بیلوں کو مخاطب کر کے بولا: "پیارا جیک کے لونڈے کی طرح پھلتا ہے۔" نعیم کا جی چاہا کہ رک کر اس سے بات کرے، لیکن ہولے ہولے دھکوں کے پیچھے چلتا رہا اور بات کئے بغیر ہی اس نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور مسرور پایا۔ گنے کی فصل زیادہ تر کاٹی جا چکی تھی۔ کہیں کہیں دو دو چار چار مرلے کھڑی تھی۔ "شاید شکر بنا رہے ہیں۔" جیب سے ہاتھ نکال کر اس نے ایک گنے کو چھوا۔

کھیتوں کے بیچ میں پہنچا، وہ جوہڑ کے کنارے پر آنکلا۔ چلتے چلتے اس نے ایک کنکر اٹھا کر جوہڑ کی سطح پر پھینکا۔ پتھر کے کہرے کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی اور کنکر وہیں پڑا رہا۔ نعیم نے رک کر حیرت سے پانی کی سطح کو دیکھا اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر پھینکا۔ اب کے کہرے کے ٹوٹنے اور پتھر کے پانی میں ڈوبنے کی آواز جوہڑ کی خاموش سطح پر سے اٹھی اور اس نے لہروں کو کہرے کے نیچے دور دور تک پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ "میں نے تمہارے لئے رستہ بنا دیا ہے۔ مچھلیو......" اس نے خوشی سے دل میں کہا۔

جوہڑ کے کنارے پر اکلوتا گھر دیکھ کر اسے مہندر سنگھ کی یاد آئی اور پھر کتنے ہی مردہ دوستوں کی یاد جو اس کے ساتھ روشن پور سے روانہ ہوئے اور لوٹ کر نہ آئے۔ اس نے ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کی اور کندھے جھکائے وہاں سے گزر گیا۔

رستے کے موڑ پر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے مغلوں کا گھر تھا۔ اس کا اپنا گھر "لیکن...... اوہ۔" آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نزدیک گیا۔ دروازے پر شیشم کی لکڑی کا کواڑ تھا جس پر خوش نمائی کی خاطر بے شمار لوہے کی کیلیں گاڑی گئی تھیں۔ دیوار پکی سرخ اینٹوں کی تھی، جیسی روشن آغا کی حویلی کی تھی۔ دیوار کے اوپر سے پکے مکان کا چوبارہ نظر آ رہا تھا۔ دو دفعہ نعیم نے آہستہ آہستہ دروازے پر ہاتھ رکھا اور اٹھا لیا۔ "دو برس......" اس نے سوچا۔ "اس عرصے میں کیا نہیں ہو سکتا! میرا باپ زندہ ہے؟ یہ کس کا مکان ہے؟"

وہ دیر تک وہیں کھڑا کندھے دیوار کے ساتھ رگڑتا اور زمین پر پاؤں مارتا رہا حتیٰ کہ دن کا اجالا سارے

میں پھیل گیا اور جوہڑ کی سطح پر کہرا پھیلنے لگا۔ اس وقت ساتھ والے گھر کے بے کواڑ کے دروازے سے ایک بیل کا سر نمودار ہوا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بوڑھی مشکوک نگاہوں سے نعیم کو دیکھا۔ نعیم نے ٹوپی ماتھے پر اونچی کر کے اسے سلام کیا۔

''ہاہ...... آہا آہاہا......'' بوڑھے ہمسائے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر حیرت اور مسرت کے مارے منہ کھولا اور دھوئیں اور بھاپ کا ایک بادل چھوڑا۔ ''نیاز بیگ کا بیٹا ہے تو؟ تو کب آیا؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ نوجوانوں کی سی پھرتی سے چھلانگ لگا کر بیل پر سے اتر آیا اور نعیم کی آستین کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔ ''ابھی آ رہا ہے؟ کلکتے سے؟ تو تو موٹا ہو گیا ہے۔''

پھر وہ اس کا بازو چھوڑ کر دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگا: ''نیاز بیگ! ابھی تک سو رہا ہے بڈھے اچھی۔'' وہ چلایا۔ ''دیکھ تیرا بیٹا آیا ہے۔ باہر کھڑا ہے کب سے۔ تیرا بیٹا جس کے کر اس کی زمین سے اس دفعہ من من کا تربوز اترا اور جس کے اناج سے تو نے محل کھڑا کیا ہے اور جس کے سبب تو چوہدری بن گیا ہے وہ باہر آیا ہے۔ اور تو نے گھوڑی بھی نہیں بھیجی؟ اپنا بچھڑا پڑ رہا ہے۔ تو نے آگ جلائی ہے؟ اب عورتوں کا پیچھا چھوڑ کر باہر آ۔''

پھر وہ دروازہ پیٹنا اور چلانا چھوڑ کر وہ مڑا اور اس کے کوٹ کے بٹن مروڑتے ہوئے بولا: ''میں نے کئی بار تمہیں پوچھا۔ تم کلکتے میں تھے۔ میرا بیٹا مارا گیا ہے۔ اب ... کے بیٹے میرے بیٹے ہیں۔ اور تمہیں پالا تو نہیں لگ گیا؟ بولتے کیوں ... ایک ... تو تمہارا ... تک میں بول نہ سکا۔ میری زبان اکڑ گئی تھی۔''

نعیم نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ بات کر سکتا تھا۔ ''مگر مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

شیشم کی لکڑی کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی احمد دین کے منہ سے پھر ملامت آمیز الفاظ کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر نیاز بیگ نعیم کو دیکھتا رہا اور نعیم نے دیکھا کہ دو برس کے عرصے میں اس کا باپ بہت بوڑھا ہو گیا تھا کہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا منہ کھل گیا اور نچلا جبڑا تیزی سے کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اور بیٹے نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیاز بیگ نے باہر نکل کر اس کے ماتھے کو اور داڑھی کو اور گردن اور کوٹ اور اصلی اور نقلی ہاتھوں کو چوما۔ ساتھ ساتھ وہ مبہم سی آوازیں نکالتا گیا جو گونگے آدمی کی ان آوازوں سے مشابہ تھیں جو وہ خوشی کے وقت یا باتیں کرنے کی کوشش میں حلق سے نکالتا ہے۔ شور سن کر آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور لڑکے باہر نکل آئے اور کھڑے ہو کر باپ بیٹے کے ملنے کا تماشا دیکھنے لگے۔ اندر جانے سے پہلے نعیم نے ارد گرد نظر ڈالی۔ دیکھنے والوں نے نظریں جھکا لیں۔ روشن آغا کے بعد وہ پہلا شخص تھا جس کا احترام کرنا گاؤں والوں نے سیکھا تھا۔

گھر کے اندر نعیم کی ماں اپنی پرانی عادت کے مطابق اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ اس نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی ماں پر ان برسوں کا بہت کم اثر ہوا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور جلد ملائم اور چکنی تھی۔ وہ اسے گھیر کر

اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ کچے فرش کو پار کرتے ہوئے نعیم نے چھوٹی عورت کو دیکھا جو پانچ سال کے علی کو لئے اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر نعیم فرش پر پاؤں مارتا ہوا بولا: ''میرا خون جم گیا ہے۔''

''آگ لا کمبخت۔'' نیاز بیگ بڑھیا پر چیخا۔ ''اور اب ہو ہو بند کر۔ جانتی نہیں سن چودہ کے بعد کس اب کے سال جاڑا پڑا ہے۔ ہو ہو ہو......'' وہ اپنی بیوی کی نقل اتارنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد نعیم کوٹ اور ٹوپی اتار کر سرخ کوئلوں کے آگے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھینس کے گرم دودھ کا کٹورا اور سرخ گیہوں کی روٹی تھی اور وہ سردی سے اکڑے ہوئے جبڑوں کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔

''یہ سب تمہاری زمین کا ہے۔'' نیاز بیگ اسے بتا رہا تھا۔

''میری کا؟'' دودھ اور روٹی چباتے ہوئے نعیم بے دھیانی سے بولا۔

''ہاں۔ آخر کار اس کی زمین تھی۔ [illegible] اتنا پھل پڑا کہ میں نے یہ سب بنایا اور نور پور کے دس کسانوں کو بیج کے لئے اناج دیا اور ابھی تک کوٹھی بھری رکھی ہے۔ جب تم سو کر اٹھو گے تو سب دکھاؤں گا۔ یہ فرش اور چوبارہ اور دیواریں میں نے خود بنائی ہیں اور ایک جوڑی (بیل) جاٹ نگر کے چودریوں سے خریدی ہے۔ جب میں جیب میں رقم ڈال کر جاٹ نگر جانے لگا تو لوگوں نے کہا چودریوں کے ہاں خریداری کر جانا کوئی مذاق [illegible] چاچا [illegible] تمہارا [illegible] گیا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا۔''

''ایسی چادریں ہمارے پاس گیارہ اور ہیں۔'' اس کی ماں نے خوشی سے بستر کی چادر کو چھو کر کہا۔

''تو بیچ میں مت بول کمبخت۔'' نیاز بیگ نے اس پر انگلی ہلائی۔ ''سارے گاؤں کو پتہ ہے۔ گیارہ اور ہیں۔''

نعیم نے برتن خالی کر کے زمین پر رکھ دیا اور آستین سے منہ صاف کیا۔ اس وقت علی جو بے آواز قدموں سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا، پیچھے سے نکل کر بولا: ''میرے لئے شہر سے کیا لائے ہو؟''

نعیم نے بچے کی اداس، معصوم آنکھوں میں دیکھا اور اس کے دل میں شدید کم مائیگی کا احساس پیدا ہوا۔ اس نے منہ پھیر کر دل میں گالی دی۔

''میں شہر نہیں گیا تھا۔'' اس نے علی کے گال کو چھو کر کہا۔

''جاؤ جاؤ۔ تنگ مت کرو۔ تھکا ہوا ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔'' نیاز بیگ نے ہاتھ سے لڑکے کو پرے دھکیل دیا۔ پھر کندھے سے پکڑ کر کھینچتا ہوا نعیم کو باہر لے گیا۔

''یہ مشکی بیل اس علاقے میں دور دور تک مشہور ہے۔ اسے کھولنے کے لئے تین دفعہ چور آئے تھے۔ پھر میں نے دروازے میں میخیں ٹھونک دیں۔ یہ سب میں نے اپنے ہاتھ سے ٹھونکی ہیں۔ میں نے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ خود بیائی کرتا ہوں، فصل کاٹتا ہوں۔ جب ہاتھ سے کچھ نہ کرو گے تو کیا پاؤ گے۔'' اس نے فخر سے دونوں ہاتھ

پھیلائے۔ سوکھی جلد میں سے لکڑی کی طرح سخت اور خشک ہڈیوں کے جوڑ ابھرے ہوئے تھے۔ ''یہ کھلیان بھی میں نے بنایا ہے۔ آؤ اناج دیکھو۔'' اس نے اناج والے کمرے کا تالا کھولا۔ نعیم نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئی تھیں اور چلتے ہوئے اسے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔

''بابا، تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو۔'' نعیم نے ہنس کر کہا۔

نیاز بیگ کی آنکھوں میں یکبارگی دہشت کی جھلک آ گئی۔ وہ اس سوال کا متوقع تھا۔

اس نے منہ پھیر کر گیہوں کی مٹھی بھری اور مصنوعی سخت لہجے میں بولا: ''میں کسی کے لئے عورتوں کی طرح نہیں روتا۔ میں کام کرتا ہوں۔ میں نے مکان بنایا ہے۔ محنت سے انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

لیکن نعیم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے اور مکان بنانے کے باوجود بیٹے کے صدمے نے اسے ختم کر دیا ہے۔

جب دھوپ گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوئی اور کھیتوں کا کہرا پگھل کر زمین میں جذب ہو گیا تو وہ کوئلوں کی آگ سے گرم کئے ہوئے کمرے میں گھس کر سو گیا۔

وہ سو کر اٹھا تو دھوپ ڈھل چکی تھی اور نیاز بیگ صحن میں گھوڑی کو لوٹا کے نعل ٹھونک رہا تھا۔ نعیم کو دیکھ کر بولا: ''دو مرلے [illegible] سارا [illegible] بیچ دیا ہے [illegible] آخری [illegible] گیا [illegible] لیکن [illegible] رکھ لیا ہے۔ اساڑھ میں بیچوں گا جب بھاؤ چڑھے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔''

گھوڑی کے نعل ٹھونک کر وہ دونوں گنا دھونے کے لئے روانہ ہوئے۔ کھیتوں کے بیچ بیچ نیاز بیگ آگے آگے چلتا ہوا مستقل باتیں کرتا رہا۔ اس نے ہر ایک کھیت کے کاشتکار کی کاہلی اور کام چوری کے قصے سنائے اور پچھلے دو برس میں جو جو فصلیں ان کے کھیتوں میں سے اتریں ان کا اپنی فصلوں کے ساتھ مقابلہ کر کے بتاتا رہا۔

گاؤں سے باہر نکل کر نعیم کی نظر غیر ارادی طور پر مغربی کونے کی جانب اٹھ گئی۔ وہ پھونس کی چھت والا ایک کمرے کا مکان تھا جس کے احاطے کی شکستہ دیواریں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ نعیم نے چلتے چلتے خفیف سی جھرجھری لی اور نظریں چرا لیں۔

''یہاں سے ہماری زمین شروع ہوتی ہے۔'' نیاز بیگ نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ''تم ایک قدم ایسی جگہ پر نہیں رکھ سکتے جہاں فصل کی جڑ نہ ہو۔ آ...... ہم۔ میرے گنے کو دیکھنے کے لئے سارا جاٹ نگر چل پڑا تھا۔''

نعیم کو گنوں پر کام کرتی ہوئی تین لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے پھر ہاتھ پھیلایا۔

''آ...... ہاہا...... یہ احمد دین کی بہو ہے یہ بیٹی ہے۔ اس کی کمائی ختم ہو گئی ہے۔ محنتی لڑکیاں ہیں۔ ہمارے گھر میں اب ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے۔'' وہ نعیم کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ ''اور تو...... تو کون ہے؟''

تیسری لڑکی جو تیز معلوم ہوتی تھی سفید سفید دانت نکال کر ہنسی۔ ''میں رحمو کی بیٹی ہوں۔ تم نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے چچا؟''

نیاز بیگ کھسیانا ہو کر پاؤں پٹخنے اور ان کے گرد گھومنے لگا۔ ''کام کرو۔ جوان لڑکیوں کو زیادہ بولنا نہیں چاہیے۔''

لڑکیاں جو نوجوان اور صحت مند تھیں ہنسیں' نعیم کو دیکھ کر شرمائیں اور پسینے سے نم گالوں اور چھاتیوں کے ساتھ کام میں جٹ گئیں۔ وہ گنے چھیل رہی تھیں۔

رات کو مویشیوں کے احاطے میں گڑ کا کڑاہ چڑھا' جیسے ہر روز رات کو چڑھتا تھا۔ نیچے گنے کے چھلکے کی آگ جلائی گئی۔ نئے بیل جوتتے ہوئے نیاز بیگ نے ایک بار پھر ان کی تعریف کی اور جاٹ نگر کے چوہدری کا قصہ دہرایا۔ گاؤں کا ایک نوجوان جولاہا بیلنے پر آ بیٹھا تھا اور چھیلے ہوئے گنے اس میں دے رہا تھا۔ ایک اور نوجوان تھوڑے تھوڑے وقفے پر رس نکلے ہوئے گنے کا گودا اٹھا کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیتا اور خشک گودا آگ میں جھونک دیتا۔ تیسرا نوجوان رس کے بھرے ہوئے گھڑے اٹھا اٹھا کر کڑاہ کے پاس قطار میں رکھتا جا رہا تھا۔ نیاز بیگ کھڑا ابلتے ہوئے رس میں لکڑی ہلا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھنڈی ترئی کی جڑوں کا رس کڑاہ میں نچوڑتا جس سے گڑ کا میل کٹ کر اوپر آ جاتا۔ لکڑی کے چمچے سے میل اتار کر وہ پھر لکڑی ہلانے لگتا۔ جوش کھاتی ہوئی رس کی میٹھی' گرم خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ نیاز بیگ بولتا جا رہا تھا۔

''مظفری کے سارے گڑ کے سوداگر میرا نام جانتے ہیں۔ پچاس گاؤں کا گڑ رکھ دو' میرے گڑ کو یوں پہچان لیں گے جیسے اس پر میرا نام لکھا ہو۔ سوڈے کی ایک چٹکی نہیں ڈالتا۔ اور لٹھے کا سا سفید گڑ بناتا ہوں۔ بھنڈی کی کیا بات ہے' ساری کرامات ہاتھ کی ہے۔''

عام دستور کے مطابق گاؤں کے کئی نوجوان' جن کی اپنی فصل نہ تھی' وہاں جمع تھے۔ دن بھر کا کام ختم کرنے کے بعد اس وقت وہ آگ سے اپنے آپ کو گرم کرنے اور گڑ کھانے کے لئے آ بیٹھے تھے اور نیاز بیگ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔ کسانوں کے سادہ اکھڑ مذاق' گاؤں کی لڑکیوں اور اپنے معاشقوں کی باتیں اور دن بھر کی اور کئی چھوٹی موٹی خوشی اور غم کی باتیں' اور کہانیاں' چاند کی اور ستاروں کی اور رات سے متعلق ہر ایک چیز کی توہمات سے بھرپور کہانیاں' اور گانا۔ بیلنے والے نوجوان نے گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے بیلنے میں گنے دیتا جا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ کان پر رکھے منہ چاند کی طرف اٹھائے گا رہا تھا۔ وہ چاند کے اور محبوب لڑکی کے بارے میں ایک دیہاتی گیت تھا۔ نعیم نے سوچا کہ یہ گیت صرف رات کا گیت تھا۔ سرد رات میں گانے والے کی بھاری' بے فن آواز فضا میں جمی ہوئی چاندنی کو توڑتی ہوئی دور تک جا رہی تھی اور سننے والوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ سیدھی سادی دیہاتی آوازوں میں لچک اور لہراؤ کی کمی کے باوجود اس قدر گہرائی اور وزن ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ سب سے الگ چھلکے کے ڈھیر پر بیٹھا پاس سے گزرتے ہوئے بیلوں کو ہر پھیرے پر چھڑی جماتا جا رہا تھا۔

UrduPhoto.com

ایک پہر رات گزر چکی تھی جب شیشم کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور ایک شخص کمبل میں لپٹا ہوا اندر داخل ہوا۔ آگ کی روشنی میں آنے پر نعیم نے ماسٹر کا چہرہ پہچانا اور اس کے جسم میں انجانے خوف کی جھرجھری پیدا ہوئی۔ چند نوجوانوں کے سلام کا جواب دے کر اور نیاز بیگ کی سنی ان سنی کر کے وہ نعیم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے سنا تھا تم آ گئے ہو'' اس نے بیلوں پر چند چھلکے پھینکتے ہوئے کہا۔

نعیم خاموش رہا۔

''دو سال..... کیا کرتے رہے؟''

''کام۔'' نعیم نے مختصراً جواب دیا۔

''کہاں؟ کہاں؟''

''تو.....''

''تو کیا؟'' ماسٹر نے چھلکے اتارتے پوچھا۔

''تو جگہوں پر۔ مجھے نام یاد نہیں رہے۔''

''کام بتا؟''

''چند ایک جگہ پر رہا۔ باقی میں تو خفت ہی اٹھانی پڑی۔''

''او... [illegible] ... ہے ہوں ... [illegible] ... اور فتح سے پہلے ضرور آتی ہے۔ محبت طاقت ہے طاقت جو کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ جو کم مائیگی کے احساس سے...'' باتیں کرتے کرتے اس نے سر اٹھایا اور نعیم کی آنکھوں میں شدید کھچاؤ دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ''وہ...... ان باتوں کا یہ وقت نہیں۔''

UrduPhoto.com

''مجھے ان باتوں کی کوئی خواہش نہیں۔'' نعیم نے تیزی سے کہا۔ ماسٹر نے اس کے چہرے پر برہمی کے آثار کو تعجب سے دیکھا اور خاموش بیٹھا گنے کے چھلکے کو انگلیوں میں مروڑتا رہا۔ بیلنے پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پھر گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی اونچی جاندار آواز رات کے سناٹے میں نعیم نے جیسے بہت دور سے سنی اور اس کے دل میں گانا سننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ گیت، جس میں محبوب لڑکی کا ذکر تھا اور گیہوں اور مکئی کے کھیتوں کا اور گھوڑوں، شاہسواروں، کبڈی کے کھلاڑیوں اور نوجوانوں کے ناچ کا اور محبت کے غم کا اور محبوب مردوں کی موت کا ذکر تھا آدھی رات کا گیت جس میں ماگھ کی سرد چاندنی کی تمام تر موسیقی گھلی ہوئی تھی جس میں زندگی کی کتنی ہی چھوٹی بڑی مسرتیں تھیں جن سے وہ اتنا عرصہ محروم رہا تھا۔

ماسٹر نے آنکھوں کے کونوں میں سے نعیم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اب کہاں جاؤ گے؟''

''اب میں کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں رہوں گا۔''

دیر تک وہ خاموش بیٹھے گویے کی آواز سنتے رہے اور مٹی کے آبخوروں میں سے مکھن ملا گرم گرم گڑ کھاتے رہے جو نیاز بیگ نے ان کو دیا تھا۔ "جس گھوڑے کو اس کا ایک آبخورہ کھلا دو وہ چاروں پاؤں پر اٹھ کر یہ دیوار پھاند جائے گا۔ اس نے کہا تھا۔ "کھاؤ۔ سن چودہ کے بعد اتنا جاڑا۔۔۔"

گڑ سے لتھڑی ہوئی انگلیاں صاف کرتے ہوئے ماسٹر پھر بولا: "تمہارے بعد بہت لوگ تمہیں پوچھنے آئے۔"

"کون تھے؟"

"ریونیو کے اور پولیس کے۔"

"پھر؟"

"چوہدری کہتا رہا تم کلکتے گئے ہوئے ہو۔ جب وہ اتا پتا پوچھتے تو کہتا: اتنا سا تو شہر ہے۔ جا کے خود ڈھونڈ لو۔"

نعیم ہنسا۔ "بابا اس معاملے میں ہوشیار ہے۔"

گانے کے بول بڑھتی ہوئی رات میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ ماسٹر بظاہر گیت سے بے خبر بیٹھا تھا، پیالہ رکھا اور اداس مگر مضبوط آواز میں بولا۔

"ایک نئی مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔"

"[illegible]"

"ہندو مسلم سوال۔"

"اوہ۔۔۔۔۔"

"دلی میں فساد ہوئے ہیں۔ مسجد کے آگے باجا بجانے پر، گئو کشی پر۔ اب یہاں پر بھی کچھ لوگ آ گئے ہیں جو ان چیزوں کو ہوا دے رہے ہیں۔"

نعیم کا جی چاہا کہ ان لوگوں کے متعلق کچھ پوچھے لیکن اس موضوع سے اسے جو ہچکچاہٹ اور نامعلوم سی دہشت تھی اور آ گئی اور وہ چپ کا بیٹھا رہا۔

"یہ چیزیں صحت مند تحریکوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔" ماسٹر نے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اسے زیادہ دیر تک نہ کھینچ سکا اور بات جلد ہی ختم ہو گئی۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماسٹر نے اپنا بڑا سا بے تکلف ہاتھ بڑھایا۔ نعیم نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔

"خفا مت ہونا، ماسٹر۔ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنا کام ختم کر دیا ہے۔ اب میں یہیں رہوں گا۔ تم نے میرے باپ کی حالت دیکھی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ ہر شخص کا اپنا کام ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔" ماسٹر نے جلدی سے کہا، لیکن وہ اپنے

UrduPhoto.com

چہرے پر ناگواری کے اثرات کو چھپا نہ سکا۔

جانے سے پہلے نعیم نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ اور اس وقت اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ وہ ہاتھ محض مردہ گوشت اور ہڈیوں کا بھاری وزن تھا۔ اس کی چھٹی حس نے جو ایسے موقعوں پر تیزی سے کام کرنے لگتی تھی' اسے آنے والے خطرے کا نامعلوم سا پتہ دیا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے بوڑھے اداس چہرے کو غور سے دیکھا۔

''ماسٹر' تم نے مجھے اپنی کہانی نہیں سنائی۔ تم نے کہا تھا......؟''

''ابھی وقت نہیں پھر کبھی سہی۔'' اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اونچے ہوتے ہوئے چاند کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح جدا ہوئے' یہ جانے بغیر کہ وہ آخری بار مل رہے ہیں۔ گانے والے کی آواز دیر تک ان کے پیچھے بلند ہوتی رہی۔

صبح سو کر اٹھنے کے بعد نعیم نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ دھوپ ابھی آنگن میں نہیں آئی تھی۔ رات بھر جاگنے کے بعد اس کا باپ اب سو رہا تھا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ نقشی ریشم کے سرخ لحاف میں اس کا بوڑھا جسم گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کوئلے دہکتے ہوئے رکھے تھے اور تازہ آگ کی میٹھی' گرم باس کمرے میں پھیلی [illegible] اور علی [illegible] کے پاس کھڑے تھے۔ اس نے کان سے پکڑ کر علی کو اٹھایا اور ہوا میں اچھالا۔ لڑکا آواز نکالے بغیر اس کے کندھے پر آن گرا اور اس کی گردن کا گھوڑا بنا کر بیٹھ گیا۔ نعیم ان دونوں کو لے کر احاطے میں نکل آیا۔

''تم تو بڑے لمبے ہو گئے ہو۔'' اس نے بڑے لڑکے کی گردن نیچے سے دباتے ہوئے کہا۔

لڑکے اس کے ساتھ مانوس نہ تھے اور شرما رہے تھے۔ مگر چند ہی باتوں میں کھل گئے۔

''میں گھوڑی دوڑا لیتا ہوں۔'' علی اس کی گردن پر چڑھا چڑھا بولا۔

''میں گھوڑی پر کھڑا ہو کر اسے دوڑا لیتا ہوں۔'' راول نے کہا۔

''جب میں تمہارے جتنا تھا تو اس پر سیدھا لیٹ کر دوڑایا کرتا تھا۔'' نعیم نے گپ ماری۔

''سیدھا لیٹ کر؟'' دونوں لڑکے تعجب سے یک زبان ہو کر بولے۔

''لو اسے دوڑاؤ۔'' نعیم اسے سفید گھوڑی کے قریب لے گیا جس کی تعریف اور خریداری کی لمبی کہانی' جو اس نے اپنے باپ سے سنی تھی' وہ اب بھول چکا تھا۔

علی مینڈک کی طرح اس کے کندھے پر سے کود کر گھوڑی کی پشت پر جا پہنچا۔ گھوڑی اس اچانک دھچکے سے پچھلے پاؤں پر اٹھی اور علی اس کی ایال پکڑنے کی کوشش میں پھسل کر زمین پر آ رہا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے قہقہے لگائے۔ علی کھسیانا ہو کر ہنسا اور ڈھٹائی سے اس کی دم کے ساتھ لٹکنے لگا۔

''کلکتے میں بھی گھوڑے ہوتے ہیں۔'' راول نے پوچھا۔

''ہاں۔ گاڑیوں میں جتتے ہیں۔''

''بیل گاڑیوں میں؟''

''نہیں گھوڑا گاڑیوں میں۔''

''گدھا بھی ہوتا ہے؟''

وہ وہیں کھڑا ان کے ساتھ گپیں مار رہا تھا کہ اس نے صحن میں اپنے باپ کی آواز سنی۔ اب کھانے کا وقت تھا۔ وہ تینوں اندر جا کر نیاز بیگ کے گرد تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے رات کا مکھن ملا کر گڑ کر کے کھایا' پھر بھینس کا دودھ اور روغنی روٹیاں۔ نیاز بیگ ہر شے اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہتا جا رہا تھا:

''کھاؤ کھاؤ۔ کسان اور گھوڑا جب تک کھاتے رہیں جوان رہتے ہیں۔ جب کھانا بند کر دیں تو مر جاتے ہیں۔ کسان اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔'' اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے گھوڑے کی خوراک کھا رہا تھا۔ نعیم متعدد بار اس کے مختصر سے بوڑھے جسم اور اس کی خوراک کا مقابلہ کر کے دل میں حیران ہوا۔ آخر میں انہوں نے کچے آموں کا اچار اور تربوز کھایا۔

''بھینس کا معدہ خراب ہو جائے تو اچار کی پھانک دیتے ہیں۔ اچار کھاؤ' پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔'' نیاز بیگ نے کہا۔

UrduPhoto.com

کھانا ختم کرنے کے بعد نعیم نے اپنے فوجی تھیلے میں سے فرانس سے خریدا ہوا سگار نکال کر سلگایا اور دھوپ میں بیٹھ کر پینے لگا۔ جنگلی انگور کی بیل اس کے سر پر جھکی ہوئی تھی اور اس میں کئی ننھی ننھی چڑیاں پر پھلائے بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ سردیوں کا آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا اور فضا میں تمباکو کے چمکیلے تار اڑ رہے تھے۔ تلخ' سیاہ تمباکو پیتے ہوئے اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد جاڑوں کی ایک سہانی صبح اور خوش گوار گرم دھوپ کا لطف اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے فرانس کے بازاروں اور عورتوں کے خوبصورت لباس کو یاد کیا۔

نیاز بیگ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور لالچی نظروں سے سگار کو دیکھنے لگا۔

''اس کا دھواں بڑا تلخ ہے۔ مجھ کو زیادہ نہیں بھاتا۔'' سگار پر نظریں جمائے جمائے وہ بولا۔ نعیم نے اس کا مطلب سمجھ کر تھیلے میں سے دوسرا سگار نکال کر اسے دیا اور اس کے سلگانے میں مدد کی۔ نیاز بیگ نے تمباکو کا کش لے کر انچیوں کی طرح آنکھیں میچ لیں۔

''تمہارے تھیلے کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ فکر نہ کرو۔ میں نہیں پسند کرتا کہ لوگوں کی غیر موجودگی میں ان کی چیزوں کو چھیڑا جائے۔'' اس نے کہا۔

جب تک سورج اوپر آیا وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نیاز بیگ نے مصنوعی سخت لہجے میں مگر دل میں ڈرتے ڈرتے پہلی بار اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور کیوں اتنا وقت ضائع کر کے آیا تھا۔ اس کے جواب

دینے پر کہ اس نے وقت ضائع نہیں کیا تھا' نیاز بیگ نے پوچھا کہ پھر اس نے کیا تیر مارا تھا۔ نعیم کمال چالاکی سے اس سوال کا جواب ٹال گیا اور اس کو یقین دلانے لگا کہ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔

جب سورج کی کرنیں سیدھی ہو گئیں اور دھوپ ان کی جلد جلانے لگی اور وہ وقت ہوا جب گاؤں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں کا کھانا لے کر جاتی ہیں تو انہوں نے باہر ہلکا ہلکا شور سنا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ باہر نکلے۔ کسانوں کی ایک ٹولی گلی کے موڑ پر نمودار ہوئی اور ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اگلے موڑ پر غائب ہو گئی۔ اس ٹولی میں زیادہ تر نوجوان تھے جن کے چہروں پر دبے دبے جوش کی زردی اور خوف و ہراس کے نشانات تھے۔ ان میں سے کوئی باتیں نہ کر رہا تھا اور نہ ہی ان کے لب ہل رہے تھے' پھر بھی ایک عجیب طرح سے ان کے درمیان سے دھیما دھیما دبا ہوا شور اٹھ رہا تھا۔ ان میں نعیم اور اس کے باپ نے چند اجنبی شکلیں دیکھیں۔ جب وہ گزر گئے تو نیاز بیگ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اور پیچھے پیچھے نعیم اس گلی کی طرف بڑھا' جس میں سے وہ لوگ نکلے تھے۔

طویل اور ویران گلی میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ گھروں کے دروازے بند اور نیم وا تھے لیکن کوئی متنفس نظر نہ آ رہا تھا وہ دونوں ابھی وہیں کھڑے تھے کہ گلی کے دوسرے سرے سے ایک عورت بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔ سورج اس کی پشت پر تھا اور سراسیمگی میں اس کے دونوں پاؤں بیچ میں بہنے والی نالی کے دونوں طرف باری باری پڑ رہے تھے اور وہ عجیب مضحکہ خیز طریقے سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا لہنگا ہوا میں اڑ رہا تھا اور وہ اپنے دودھ والے بچے کو چھاتی میں دبائے ہوئے [illegible] کے زرد کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چیخ نکلی۔ "مار دیا۔ خون کر دیا ظالموں نے۔" اور بچہ اس کے ہاتھوں سے لٹک گیا۔

نیاز بیگ نے لپک کر بچے کو سنبھالا۔ "کس کو...... کس نے؟"

"اس کو...... ماسٹر کو ہائے ہائے" وہ روتے ہوئے بولی۔

"کہاں...... کہاں پر؟ کیوں...... ہیں؟" نیاز بیگ نے بے صبری سے پوچھا۔

عورت کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ "ہائے چاچا نیاز بیگ وہ بڑا بھلا مانس تھا۔"

یکلخت بے حد اکتا کر نعیم پلٹا اور گھر میں داخل ہوا۔ بے چینی سے اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ گھوڑی نے جھرجھری لی اور مانوسیت سے اس کے کندھے پر منہ رگڑا۔

"مجھے کیا......؟" فضا میں دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

پھر وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں جو بیٹے کے آنے پر مغرور ہو گئی تھی' صبح صبح دوسری عورت کے ساتھ خوب زور کی جنگ کرنے کے بعد اس وقت اطمینان سے بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ باجرے کی بیٹھی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر چبانے لگا' پھر اسے نگلنے کی کوشش میں اگل دیا اور لعاب کا گولہ اس کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔ غصے سے جھلا کر اس نے روٹی کا ٹکڑا دور پھینکا اور اونچی آواز سے بولا:

"مجھ کو اس سے کیا غرض؟"

صحن میں کھڑا ہو کر وہ نلکے کی ہتھی مروڑتا رہا، پھر اس نے اچک کر ہمسائے احمد دین کے صحن میں دیکھا، انگور کی بیل پر بیٹھی ہوئی تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی، گائے کے چار دن کے بچھڑے کو بازو میں لے کر اٹھایا اور رکھ دیا، دروازے میں کھڑے ہوئے علی کو اشارے سے بلایا جو اپنی ماں کے ڈر سے کمرے میں غائب ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ نلکے کے پاس گیا اور ٹونٹی کے ساتھ منہ لگا کر بہت سا پانی پیا۔ جب پانی پی چکا تو جیب میں ہاتھ دے کر باہر نکل گیا۔

اب گلی میں اکا دکا آدمی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور نیچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے میراثی کو روک کر نعیم نے پوچھا: "کیا بات ہوئی ہے؟"

"ہونی کی بات تھی چوہدری۔ مدت سے تمہیں پتہ ہے سائیں کے ڈیرے پر پندرھویں کے پندرھویں گائے ذبح ہوتی آئی ہے۔ آج ہندو ضد پر آ گئے۔ ضد پر کیا آ گئے، یہ سب ان سوروں کی شرارت ہے جو باہر سے آئے ہیں۔ بس جھگڑا بڑھ گیا۔ ماسٹر جو بیچارا ادھر کا نہ ادھر کا، چھڑانے گیا اور سوروں نے اسے ختم کر دیا۔ تھو تھو تھو۔ اس نے صرف اتنا کہا۔" وہ میراثیوں کے مخصوص انداز میں بات بڑھاتا چلا جا رہا تھا، نعیم وہاں سے چل پڑا۔

کھیتوں میں چلتا ہوا وہ اس جگہ پہنچا جہاں شیشم اور کیکر کے ذخیرے کے گرد اگرد جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی کچی دیوار کھچی ہوئی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک جگہ مٹی کا ایک برتن ٹوٹا پڑا تھا اور لسی بہہ کر زمین میں جذب ہو چکی تھی۔ پاس ہی ایک [illegible] اور باجرے کی روٹیاں بکھری پڑی تھیں [illegible] کے نظارے نے پریشان کر دیا تھا۔ نعیم نے پنجوں پر اٹھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھا۔ کیکر کے ایک درخت کے نیچے ماسٹر مرا پڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور زرد مردہ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ذرا فاصلے پر ایک مریل سی مٹیالے رنگ کی گائے گھاس چر رہی تھی اور ڈکرا رہی تھی۔ جب نعیم کی آنکھیں [illegible] اس نے بے دلی سے دیوار پر تھوکا اور واپس چل پڑا۔

گاؤں میں داخل ہوتے وقت اس نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو لٹھ اور بلم ہاتھوں میں تھامے چہروں پر خطرناک ارادوں کی چھاپ لئے ایک جگہ جمع تھے۔ نعیم کندھے جھکائے، جیب میں ہاتھ دیئے تیزی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔

"مجھ کو اس سے کیا غرض!" اس نے تیسری بار اپنے آپ سے کہا۔

لیکن رات کو سونے کے لئے جب وہ بستر پر لیٹا تو اندھیرے میں ماسٹر اس کے قریب آ کھڑا ہوا اور رات بھر جاگ کر بے گناہ انسانی خون کی اذیت سہتا رہا۔

وہ ماہ مارچ کا پہلا دن تھا جب نیاز بیگ منہ اندھیرے آخری بار فصل کو پانی لگانے کے لئے کھیتوں کو گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ زرد ہوتی ہوئی گیہوں کی فصل کے درمیان پھرتا اور پانی کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب پانی کھلا

تو وہ کدال اٹھا کر کیچڑ میں گھس گیا اور پانی کاٹ کاٹ کر مختلف کھیتوں کو لگانے اور باتیں کرنے لگا:

”پہلے تو ایک گھنٹے کے بعد آیا نامراد اور جو آیا تو برف کی طرح لگ رہا ہے۔ ہیں؟“ وہ جھڑک کر بولا۔ ”پر صبر، فکر نہ کر، میرا ابھی اتنا گیہوں ہے کہ ایک گھنٹے میں گھڑسوار احاطہ نہیں کر سکتا۔ تیرا بھی پھرتے پھرتے بھرکس نہ نکل گیا تو مجھے پکڑ لیو۔ تو بس دو قدم چل کر زمین میں گھس جاتا ہے۔ ہیں؟ آ میرے ساتھ، تجھے پتا چلے کہاں تک جانا ہے۔ آ، نہر کے بچے، ہٹ مان، اتنا گیہوں سارے گاؤں میں کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے۔ میں بڈھا آدمی ہوں، شرم کر، جب جوان تھا تو پتا ہے ساری ساری رات تیرے اندر کھڑا رہتا تھا اور پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس گندم کو بیچ کر مجھے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ مجھے اس کی بیماری کا علم ہے۔ اسے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ یہ مرد کی بڑی بیماری ہے۔ ہیں؟“ اس نے اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھا اور اپنی کامیاب تشخیص پر دل میں ہنسا۔ ”عورت کو پا کر اس کی ساری کاہلی دور ہو جائے گی اور وہ خود بخود کام کرنے لگے گا۔ سنا تو نے، کسی کو بتانا نہیں، نہر کے بے وقوف بچے ہیں؟“ وہ منہ پھیلا کر ہنسا اور بڑھتی ہوئی سردی کے اثر کو دور کرنے کے لئے زور و شور سے باتیں کرنے لگا۔

آخر جب سردی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو اس نے پاؤں خشک کر کے جوتا پہنا اور کدال کندھے پر رکھ کر کنارے کنارے پھرنے لگا۔

سورج دو نیزے سے بھی اوپر آ چکا تھا جب وہ گھر لوٹا، مکھن اور بادام ملے ہوئے گڑ اور بھینس کے دودھ کا ناشتہ کرنے کے [illegible] کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے [illegible] کر چھاتی کو ملا۔ ”یہ کیا سویرے سویرے ہو رہی ہے نامراد۔“ اور سینے میں پھرتے ہوئے درد کو گالی دی۔

”سبزی کی بوائی اب تک ختم بھی ہو جانی چاہیے تھی۔ پھاگن نکلا جا رہا ہے۔ یہ لونڈا اگر کسی کام کا ہوتا۔“ بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس نے دل میں بیٹے کے ناکارہ پن پر تاسف کا اظہار کیا۔

ہل چلانے کے دوران اس نے درد کو تھوڑے تھوڑے وقفے پر تیز ہوتے ہوئے محسوس کیا مگر اسے کام اور باتوں کے شور میں دبائے رکھا۔ اس کے علاوہ اسے مکھن بادام اور گڑ کی خوراک پر مکمل بھروسہ تھا جس نے ہمیشہ اسے گھوڑے جتنی گرمی پہنچا کر ساری تکلیفوں سے بچائے رکھا تھا۔ ”کسان اور بیل اگر معمولی تکلیفوں سے بیٹھ جائیں تو دنیا کے کام ہو چکے۔“ دانت پیس کر اس نے بیلوں سے کہا۔

سورج سر پر پہنچ چکا تھا جب اس نے سبزی کے لئے چھ چھ انچ زمین پلٹ کر رکھ دی۔ کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو کر وہ تھوڑی دیر کے لئے ختم کئے ہوئے کام کی مسرت میں سینے کی تکلیف کو بھول گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ابلی ہوئی گاجریں کھائیں اور حقہ پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ مگر حقہ اس سے زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ تمباکو کے ہر کش پر درد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ابھی سارے جانوروں کے لئے چارہ لے کر آنا تھا اور پھر نیاز بیگ کے لئے تو ہر بیماری کا علاج کام تھا، سخت محنت! ”پسینے کے ساتھ ساری انسانی اور حیوانی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔“ اس نے کہا اور رسّی اور درانتی اٹھا کر چارہ کاٹنے کے لئے چل پڑا۔ احاطہ پار کرتے ہوئے اس نے دن بھر کے بھوکے مویشیوں کو رحم اور

محبت کی نظر سے دیکھا۔

"میں نے دو بار کھایا ہے اور تم نے چار بار کھایا ہے اور ان کا کوئی خیال نہیں؟ ہیں؟" اس نے راول کی گردن میں درانتی چبھو کر کہا۔

"جا تو رہے ہیں۔" لڑکا گردن ملتے ہوئے غصے سے بولا۔

چارہ کاٹتے ہوئے وہ درد کی شدت سے لڑکے پر، درانتی پر اور چارے پر گرجتا رہا۔

"اگر ایک جانور بھی بھوک سے مر گیا تو میں تم سب کو گھر سے نکال دوں گا۔ وہ میرے بڑے بچے ہیں۔ تم چھوٹے ہو۔ عورتوں کی کیا پرواہ ہے۔" اس نے رعونت سے کہا۔

چارہ کاٹ کر انہوں نے دو گٹھے بنائے اور سروں پر اٹھا کر جھولتی ہوئی مخصوص چال کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ سارے رستے وہ بخار اور درد کی شدت سے بید کی طرح کانپتا رہا۔ اس کے بدن پر بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور جلد جھرجھرا رہی تھی۔ جب اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں بولا:

"میں ان راستوں پر آنکھیں بند کر کے چل سکتا ہوں۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔"

لیکن گھر کے دروازے پر گٹھا اس کے سر سے گر گیا اور وہ گردن پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر لائے اور گھر [illegible] عورتوں نے اس کی چھاتی پر تلی کے تیل کی مالش کی اور پودینے اور جنگلی بنفشے کے پھولوں کی چائے بنا کر اسے پلائی۔

تیل اور چائے کی حرارت سے وہ ہوش میں آ گیا اور نعیم کو پاس بلا کر ہدایتیں دینے لگا: "سبزی کے لئے میں نے زمین تیار کر دی ہے۔ کریلے اور کدو کے بیج علی کی ماں سے لے لینا اور چار دن کے اندر اندر بو دینا۔ ورنہ زمین خراب ہو جائے گی۔ تم نے سرسوں کے پھولوں کو دیکھا ہے۔ پھاگن نکلتا جا رہا ہے اور گیہوں کو اب پانی نہیں لگے گا۔ آج آخری بار لگا دیا۔ یہ شاید اسی کی برکت ہے۔ بدبخت برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اور چنے چیت کے پہلے دنوں میں تیار ہو جائیں گے۔ لیکن تمہیں ان کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔ اس وقت چارہ کاٹ کر جانوروں کو ڈال دو۔ سویرے سے بھوکے ہیں اور گھوڑی کے پچھلے پاؤں کے نعل گھس گئے ہیں۔ چڑھنے سے پہلے نئے ٹھونک لینا، ورنہ کھر زخمی ہو جائیں گے۔"

نعیم پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا "اچھا بابا..... اچھا بابا" کہتا جا رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے نیاز بیگ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا لیکن اس نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے ہدایتیں جاری رکھیں۔

"اور کام کرو...... کام کرو۔ محنت سے میں نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ محنت سے تم اسے کھڑا رکھو گے ورنہ یہ گر جائے گا۔ میں اچھا ہو جاؤں تو تمہارے لئے عورت کی تلاش میں نکلوں گا۔ فکر نہ کرو۔ عورتیں ناکارہ ہوتی ہیں۔ لیکن کسان کے لئے عورت بڑی مفید ہوتی ہے۔ فکر نہ کرو۔" وہ ہونٹوں میں مسکرایا۔

''اچھا بابا''۔ نعیم نے کہا۔ وہ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ شام کے وقت جب کمرے میں دیا جلا تو اس نے آخری بار نعیم کو پاس بلایا۔ جب وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو اس نے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس کا سارا غرور ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ فقط ایک مرتا ہوا انسان اور ایک باپ تھا۔

بنفشے کے پھولوں کی چائے اور تلی کے تیل کے باوجود آدھی رات کے قریب وہ مر گیا۔

اس کے جنازے پر سارا گاؤں اُلڈ آیا۔ مرنے والے کا بیٹا روشن آغا کے بعد گاؤں کا امیر ترین شخص تھا اور ابھی کنوارا تھا۔ آنے والوں میں بعض ایسے کسان بھی تھے جو اس کے باپ کے پرانے دشمن تھے اور ایسے بھی جو اس کی سخت طبیعت اور اس کی ڈینگوں کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی نئی نئی حاصل کی ہوئی دولت کا خیال کر کے جلتے تھے۔ اس وقت وہ سب غمزدہ دکھائی دے رہے تھے اور نعیم کے پاس بیٹھے افسوس ظاہر کر رہے تھے۔

''جس وقت مجھے خبر ملی میں مکئی کے کھیت میں تھا۔ میرے ہاتھ پھاوڑے سے چھوٹ گئے۔ یوں لگا میرے بچے کہ جیسے دل پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہو۔'' ایک بوڑھے کسان نے مٹھی ہوا میں لہرا کر کہا۔

''مجھے میری عورت نے بتایا کہ چوہدری ن...... ن'' اتنا کہنے کے بعد دوسرے کسان نے ایسا حلیہ بنایا کہ سب مجھے [illegible] اور [illegible] دیا تھا۔ اب وہ [illegible] تو'' اس نے رک کر دوبارہ رونے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی کئی سننے والوں کے چہرے بھی بگڑ گئے۔ بولنے والا فوراً اصلی حالت پر آیا اور ہاتھ پھیلا کر بات جاری رکھی۔ ''اتے اتے...... اتے اتے بڑے تربوز تھے اس کے کھیت میں جو اس نے مجھے دیئے۔ ہائے وہ تربوز اب کہاں؟'' وہ جھکا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ پاس بیٹھے والوں میں سے کوئی روتا اس نے خشک آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ''جب وہ جیل سے آیا تو اس نے کبھی ان تربوزوں کا ذکر مجھ سے نہ کیا۔ ہا۔''

کچھ دیر تک رونے کی بے سود کوششوں میں اس کا ساتھ دینے کے بعد حاضرین اس کی اس قدر صریح بہانے بازی سے تنگ آ گئے اور ان میں غصے کی لہر بڑھنے لگی۔ ایک مرتبہ جب وہ جھکا تو اسے اسی حالت میں چھوڑ کر تیسرے کسان نے بے صبری سے اپنی بات شروع کر دی:

''چوہدری بڑا دل والا جوان تھا۔ جب مجھے میلے پر جاتے ہوئے دیکھتا تو ہمیشہ میری پیٹھ ٹھونکتا اور کہتا 'عیش کر بیٹا...... عیش کر' ایسے زندہ دل بوڑھے اب مرتے جا رہے ہیں۔''

اسی طرح ہر ایک نے باری باری کسانوں کے چالاک اور بے فن انداز میں مرنے والے کو یاد کر کے افسوس ظاہر کیا۔

جب انہوں نے جنازہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے دونوں واویلا کرتی ہوئی عورتوں کو لاش سے جدا کر چکے تو